اسلام پرستوں کا چیلنج

ہائنز ہیڈلر*

اسلام کا احیائے نو اور مخصوص شکل کے اسلام "اسلام ازم" کی مقبولیت ایک ایسے وقت میں جڑ پکڑ رہی ہے' جب (عرب) قوم پرستی کا ماڈل اپنی عمر پوری کر چکا ہے اور سوویت سلطنت اور اس کا پشت پناہ مارکسزم' لینن ازم کا نظریہ دم توڑ چکا ہے۔ ایران میں خمینی کی فتح اور مصری صدر سادات کے قتل کے وقت سے اسلام پسندی' شمالی افریقہ سے جنوبی ایشیا تک پھیلے بحرانی خطے میں مرکزی سیاسی قوت بن چکی ہے۔ یہ قوت ان ممالک کے سیاسی استحکام اور مغرب کے ساتھ اس خطے کے ثقافتی' سیاسی' اقتصادی اور سلامتی سے متعلق پالیسی امور کو متاثر کر رہی ہے۔ قنوطی حضرات کو خدشہ ہے کہ اب جبکہ مشرق اور مغرب کا تنازعہ ختم ہوچکا ہے' ایک نیا شمال جنوب کا جھگڑا افق پر منڈلا رہا ہے۔

اسلام اور اسلام پسندی - یکساں نہیں

"فنڈا منٹلزم" اور "اسلام ازم" کی اصطلاحات دانشورانہ مباحث اور سیاست میں تواتر سے استعمال نہیں ہوتیں۔ یہاں "اسلام ازم" (اسلام پسندی) کی اصطلاح اس لیے قابل ترجیح ہے کہ اسے عیسائی اور یہودی "فنڈا منٹلزم" (بنیاد پرستی) سے ممیز رکھا جاسکے اور یہ واضح کیا جاسکے کہ بنیاد پرستی' اسلام یا دوسرے لفظوں میں ۱.۲ بلین افراد کے عقیدے سے مماثل نہیں ہے۔ اگرچہ اس کی بھی وہی مذہبی جڑیں ہیں اور اس میں انتہا پسندی ہے لیکن یہ مخصوص نظریاتی اور سیاسی نظریات کا حامل حد درجے سے بڑھا ہوا اسلام نہیں ہے۔ اس فرق کے بغیر مسلمانوں کو جنہوں نے ایک عظیم الشان ثقافت کو جنم دیا' اسلامی تحریک کے ایسے مبہم پہلوؤں سے وابستہ کردیا جائے گا جن کا نتیجہ اغلباً مسلمانوں کی طرف سے دفاعی پوزیشن اختیار کرنے اور مغرب کے ساتھ تصادم کے رویے کی صورت میں برآمد ہوگا۔

---

*Heinz Hedler, "The Islamistic Challenge", Aussen Politik, 1/97, PP.79_90

(تلخیص : سجاول خان رانجھا)

اسلام پسندی کی تشخیص کافی حد تک متنوع ہے۔ اس میں یقین دہانی ("فصاحت و بلاغت" "خیالی جنت" "خوف کی تجارت") سے لے کر حد سے بڑھی ہوئی تشویش شامل ہے۔ تازعہ اس وقت اٹھ کھڑا ہوا' جب ہارورڈ یونیورسٹی میں انسٹی ٹیوٹ آف سٹریٹیجک اسٹڈیز کے ڈائریکٹر سیموئیل پی ہنٹنگٹن کا ایک مضمون جریدے "فارن افیئرز" (۱۹۹۳ء) میں شائع ہوا' جس میں "تہذیبوں کے تصادم" کو مستقبل کے تنازعات میں سرفہرست موضوع قرار دیا گیا تھا۔ اس نقطۂ نظر سے ایک سرکردہ ماہر اور کئی کتابوں کے مصنف جرمن مستشرق اور شام نژاد ماہر عمرانیات باسم طبی اس کی بنیادی باتوں سے اتفاق کرتے ہوئے اس شدید اختلاف کرتے ہیں۔

انیسویں صدی کے اوائل سے اسلام کو ایک نئے دشمن کے طور پیش کرنے کے خلاف تنبیہات آنے لگی تھیں ۱۹۹۵ء میں "اسلام کے دشمن اور دوست" کے عنوان سے چھپنے والے ایک مضمون میں سیگفریڈ کوہل ہیمر نے اسلام کے بارے میں دشمن ہونے کے عمومی تاثر کی نشاندہی کی۔ اس کی رائے میں اسلام اور اسلام پسندی کو بالعموم ایک دوسرے میں گڈ مڈ کر دیا جاتا ہے اور "اسلامی بنیاد پرستی" پر تنقید یا تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اسے "گھسی پٹی اسلام دشمنی" کے قالب میں ڈھال دیا جاتا ہے۔ یہ بلاشبہ احمقانہ بات ہے۔ اگر اسلام کو ایک نئے دشمن کے طور پر پیش کیا گیا اور یورپ کو اسلام کے خلاف "قلعے" کے طور پر الگ تھلگ کیا گیا' تو یہ خود ساختہ پیشین گوئی کے پورا ہونے کے مترادف ہوگا۔

جس طرح دشمنی کا گھسا پٹا امیج قابل اعتراض ہے۔ اس طرح نئی ممنوعات اور دانشورانہ پابندیاں بھی درست نہیں ہیں۔ جرمن صدر رومن برزوگ نے ۱۵ اکتوبر ۱۹۹۵ء کو این میری شمل کے اعزاز میں ایوارڈ کی تقریب میں بجا طور پر کہا کہ "سیاسی راستی" جس کا اکثر حوالہ دیا جاتا ہے' آزادی اظہار کی آئینی ضمانت کے راستے میں رکاوٹ نہیں بننی چاہئے' بلکہ اسلام اور اسلام ازم کے گہرے اور زیادہ مختلف جائزے کی ضرورت ہے' جو تعصب اور اکتا دینے والے نظریاتی "اشاروں" سے پاک ہو"۔

دو ہیئتیں --- قوم پرستی اور اسلام پسندی

مشرق قریب اور وسطی کے مرکزی اسلامی خطے میں' تاریخی تناظر میں' دو ہیئتیوں یعنی نیشنلزم اور اسلام ازم کے درمیان کمیتی فرق کو واضح کیا جانا چاہئے۔ قوم پرستی نے ۲۰ ویں صدی کے آغاز سے خطے پر ساختی اثرات مرتب کئے ہیں اور یہ روشن خیالی پر مبنی ہیں۔ اس رخ بندی کے

نمائندوں میں کمال اتا ترک' ناصر' اسد' صدام حسین اور "تاریخ میں دیر سے آنے والے" عرفات شامل ہیں۔ قوم پرست مغرب کی نقل اور اس کا سنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ اسلام پسند اس کی مخالفت کرتے ہیں اور اس کی جگہ اپنا متبادل ماڈل پیش کرتے ہیں۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ' جب ناصر اسرائیل کے مقابلے میں رسوا کن شکست سے دو چار ہوئے' عرب دنیا کے لیے "پن دھارا" ثابت ہوئی' ۹۱/۱۹۹۰ء کی دوسری جنگ خلیج میں صدام حسین کی شکست قوم پرستی سے ان کے تعلق کو مزید کمزور کرنے کا باعث بنی۔

مغربی اقدار کو اپنانے سے ہونے والی مایوسی بنیادی عقائد کی جانب لوٹنے کا باعث بنی۔ اصل اسلام ایک نئے جوش اور ولولے کے تجربے سے دو چار ہوا۔ اسی کے ساتھ بنیادوں کی طرف رجوع کرنے والے اسلام ازم کے حامیوں کو روز افزوں حمایت ملنی شروع ہوگئی۔ ایک عالمگیرانہ رجحان سامنے آنا شروع ہوا۔ نکتہ آغاز اب کوئی ایک قوم نہیں' بلکہ خطہ ہے' جو عالمگیرانہ جواز کا دعویٰ کرتا ہے۔ ابتدائی دور کے اسلامی آرتھوڈکسی کی طرح' یہ رجحان ثقافت' ریاست' قانون' اور سیاست کو ایک وجود میں یکجا کرنا ہے۔ نہ صرف مذہبی تھیوری بلکہ سیاسی پریکٹس کے حوالے سے بھی۔ "دنیوی" اور "روحانی" تفریق اب مزید مطلوب نہیں ہے۔

اسلام پسندی کے پہل کار دانشور

سنی اسلام پسندی کے خصوصی پہل کار دو مصری دانشور ۱۹۲۸ء میں اخوان المسلمون کے بانی حسن البنا اور دوسرے اس کے نظریہ ساز سید قطب تھے' جنہیں ۱۹۶۶ء میں ناصر نے قاہرہ میں پھانسی پر لٹکا دیا تھا۔ جہاں البنا نے بنیادی طور پر ارتقا کا راستہ اختیار کیا' سید قطب کے ریڈیکل نظریات نے مروجہ عالمی نظام کے خلاف اور عالمگیر اسلامی غلبے کے حق میں انقلابی جدوجہد کے لیے دانشورانہ دلائل فراہم کیے۔ انہوں نے اس ضرورت پر زور دیا کہ اسلامی امہ کو دوبارہ زندہ کیا جائے تاکہ وہ پوری انسانیت کی قیادت پھر سے اپنے ہاتھوں میں لے سکے۔ خمینی کے مطابق دنیا کی تقسیم "جہالت کی شیطانی دنیا" اور مطیع و فرمانبردار اہل ایمان کی دنیا ایک عالمگیر امہ کے حق میں ختم ہونی چاہیے۔ دو عالمی تھیوری اور ایک عالمی قانون دونوں امتیازی خصوصیات کے حامل ہیں۔ اسلام کی اس تفہیم کے مطابق جس کا حوالہ عقیدے (قرآن) روایت (حدیث) اور مذہبی قانون (شریعہ) سے وابستہ ہے' دنیا دو حصوں میں تقسیم ہے یعنی "دارالاسلام" اور "دارالحرب"۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق ان دو دنیاؤں کے درمیان تعلقات کا تعین "جہاد" (سرگرمیوں میں

انتہائی تندہی اور ضرورت کے تحت "مقدس جنگ") سے ہوتا ہے۔ اس میں دوسرے فریق کو اپنے عقیدے میں لانا' اقلیتی حیثیت دینا یا جزیہ اور قتال کی صورت میں اسلام کا محکوم بنانا شامل ہے۔ اسلامی نظریے کا آخری ہدف جنگ ("حرب") کا خاتمہ ہے' جو "کافر" اسلام کے پھیلاؤ کے خلاف استعمال کرتے ہیں اور اسلام کے زیر اقتدار امن کی بحالی ہے جس کا نتیجہ دونوں دنیاؤں کے درمیان تقسیم کا خاتمہ ہے۔ یہ "امن کا تصور" اسلام پسندی کے نظریہ ساز سید قطب نے پیش کیا' جن کا کہنا تھا کہ اسلامی جہاد کے پیش نظر ایک عالمی انقلاب برپا کرنا ہے۔ ان کی رائے میں صرف اسی انقلاب کے توسط سے امن "اسلام" بحال ہو سکتا ہے' جس سے عالمی امن کا حتمی مقصد حاصل ہوگا۔ ایک ایسا منصفانہ نظام جو اسلام کی اعلیٰ اقدار پر مبنی ہے اور یہ "عالمی امن" اسلام کے اصولوں کے تحت ہوگا نا کہ باہمی رواداری کی اجتماعی بنیادوں پر۔

جہاد کے ذریعے اسلام کی توسیع کو تاریخ میں طاقت کے مراکز کی طرف سے رکاوٹوں کا سامنا رہا۔ لیکن یہ اسلام پسندوں کے لیے کوئی جوابی دلیل نہیں ہے۔ وہ اس دلیل کا حوالہ دیتے ہیں جسے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صلح حدیبیہ کے موقع پر ایک زیادہ طاقت ور حقیقت کے مقابلے میں اختیار کیا تھا۔ جس کے مطابق "کافروں" کے ساتھ کبھی بھی حتمی امن قائم نہیں ہوسکتا جب تک مسلمان شکست خوردہ ہیں اور وہ اپنے مفاد میں سٹیٹس کیو کو تبدیل نہیں کر پاتے' انہیں تھوڑے یا لمبے عرصے کے لیے جنگ بندی قبول کرنی ہوگی اور جیسے ہی وہ طاقت حاصل کرلیں گے' یہ جنگ بندی ختم کردی جائے گی۔ قرآن کے مطابق "انہیں مایوس نہیں ہونا چاہئے اور "انہیں" امن کی دعوت نہیں دینی چاہئے اگر "تم" بالادست ہو" (سورہ ۳۶:۴۷)

جمہوریت اور انسانی حقوق

جمہوریت اور انسانی حقوق کا سوال جب بھی اٹھتا ہے' اس میں اقتدار اور نظریات کے درمیان اختلاف سامنے آجاتا ہے۔ یورپ میں جمہوریت اور انسانی حقوق ایک طویل تاریخی عمل کا نتیجہ ہیں۔ اس تاریخی عمل میں فلسفہ اسمیت' مذہب انسانیت' احیائے ثانیہ اصلاح کلیسا' روشن خیالی اور جدت پسندی اہم دانشورانہ مراحل تھے۔ جبکہ مرکزیت بشریت یعنی اقتدار کا ایک ایسا نظام جس میں فرد کائنات کا مرکزی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے' مغرب میں چلتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اسلام میں "ربانیہ" یعنی مرکزیت خدا کا اصول کار فرما ملتا ہے چنانچہ اس اصول کے مطابق خدا ہی اس کائنات کا حاکم اعلیٰ ہے۔ اہل ایمان کا معاشرہ فرد پر فوقیت رکھتا ہے اور فرد

محض اجتماعیت کا حصہ ہے۔ اسلام میں "آزاد یافتہ شہری" کا کوئی تصور نہیں کیونکہ عوام کی حاکمیت اور حکومت ایسے ایک دوسرے کے مقابلے میں اقتصادی حیثیت کے حامل تصورات ہیں۔ یہ روایتی تصورات اسلام پسندوں کو اچھی نشو و نما کے لیے بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔

اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ ریاست اور قانون کی مذہب سے آزادی خارج از امکان ہے' یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں رہتا کہ جمہوریت غیر اسلامی ہے' کیونکہ یہ کسی قسم کی اقدار سے آزاد ہے۔ اسلامی آرتھوڈکس نقطۂ نظر سے "شوریٰ" معاشرے کی سطح پر سرگرمی کا وہ آزاد اسلامی ماڈل ہے' جو حقیقی جمہوریت کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس میں غیر اسلامی آپشنز کی نہیں صرف آراء کی اجازت ہے۔ اس بنیاد پر شوریٰ کو (ان کے اسلامی ہونے کے باعث) "بہتر تصورات کی آمریت" قرار دیا گیا ہے۔

اسلامی دنیا میں انسانی حقوق کی قانونی حیثیت کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ "شریعہ" الہامی قانون اور اسلامی معاشرے کے ناموں کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس میں خدا' عقیدہ اور اہل ایمان فرد سے ماورا ہیں۔ اگر فرد شریعہ کا احترام کرتا ہے' تو وہ مسلم معاشرے اور ریاست کے مقابلے میں حقوق کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ فرد کی آزادی کے حقوق اور شریعہ ناقابل مطابقت دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ اسلام پسند بین الاقوامی انسانی حقوق کو اس دعوے کے ساتھ رد کرتے ہیں کہ فرد اپنے حقوق صرف اسلامی قانونی ضابطے کے دائرے میں ہی تلاش کر سکتا ہے' قانونی جھگڑا بلاشبہ اس وقت کھڑا ہوتا ہے جب شریعہ اقدام متحدہ کے انسانی حقوق کے کنونشن مجریہ ۱۹۴۶ء اور ۱۹۶۶ء کے کم از کم معیار پر پورا اترنے میں ناکام رہے۔ یہ صورت حال بالخصوص فیملی لاز' وراثت کے بارے میں قانون اور حدود کے قوانین کے سلسلے میں پیدا ہوتی ہے۔ جہاں بھی اسلام پسند حکومت میں ہیں یا وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال میں لاتے ہیں' سب سے زیادہ اس سے خواتین متاثر ہوتی ہیں۔

انسانی حقوق کی عالمگیریت کو مشکوک بنانے والی امثال میں سے ایک سلمان رشدی کے خلاف خمینی کے فتویٰ اور اسلامی مضامین کے مصری ماہر نصر حامد ابو زید کی جانب سے جبری طلاق کے اشو نے بین الاقوامی سطح پر ہلچل مچا دی۔ اول الذکر کیس میں اس وجہ سے بین الاقوامی قانونی ضابطے کی خلاف ورزی ہوتی ہے کہ اسلامی مذہبی بنیاد پر موت کی سزا پر متعلقہ ملک کو حدود سے باہر عملدرآمد کے لیے کہا گیا ہے۔ دوسرے کیس میں ایک شادی شدہ جوڑے کو جو اپنے تعلق کو قائم رکھنا چاہتا ہے' اس بنیاد پر شادی ختم کرنے پر مجبور کیا گیا کہ اس کے ایک فریق نے الحاد کا

ارتکاب کیا تھا۔ یہ تنازعہ یورپ میں بھی نتائج پیدا کرسکتا ہے۔ اگر یورپ میں مقیم آباد کاروں پر زور دیا گیا کہ وہ میزبان ملک کے قانون و ضوابط کی پابندی نہ کریں' بلکہ اس کے بجائے وہ شریعہ کی پیروی کریں' تو یہ متعلقہ ملک کی اتھارٹی اور قانونی حیثیت کے لیے چیلنج ہوگا۔

وجوہات' مقاصد اور اسلام پسندوں کے ہتھکنڈے

مغرب کے دعوؤں کے برعکس' جو کہ بہت حد تک غیر مذہبی ہیں' اسلام پسندوں کا مسئلہ اقتصادی اور سماجی مسائل نہیں ہیں۔ اس سے یہ بات اسلام پسندوں کے لیے خارج از امکان نہیں ہو جاتی کہ وہ موجودہ مسائل کو کس طرح اپنے مقاصد کے لیے کامیابی سے استعمال میں لاتے ہیں۔ ان کے محرکات مادی نوعیت کے نہیں' بلکہ بہت حد تک روحانی' مذہبی' ثقافتی اور سیاسی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اسلام پسندی کی جڑیں ابتدائی اسلام کے دور میں تلاش کی جانی چاہئیں' جس کا جدید ترین ماڈل سیاسی اقدام کے لیے راہنمائی بنتا ہے۔ یہ پیغام مسلمانوں اور غیر مسلمانوں دونوں کو مخاطب کرتا ہے۔ مشن کا نام دعوت ہے۔ اسلام پسندوں کے بینر پر نمایاں طور پر درج ہے "صلیبی مغرب دشمن ہے" اور "اسلام ہی حل ہے"۔

دشمن کا روایتی امیج واضح ہے۔ بڑا مقصد داخلی اور خارجی سیاسی محاذ پر مغربی منطقی دنیا کے خلاف بغاوت ہے۔ تاکہ مستقل اسلامی انقلاب کے ذریعے سیاسی قوت حاصل کی جاسکے اور اس کے توسط سے زیادہ دور رس ایک نئے' عالمی نظام یعنی "زمین پر مذہبی حکومت" کے قیام کا مقصد حاصل کیا جاسکے۔ اسلامی متبادل نظام کے مبادیات مثلاً" اس کی اقتصادی اور سماجی پالیسیاں واضح نہیں ہیں۔ مغربیت کے استرداد کا مطلب مغربی ٹیکنالوجی کو مسترد کرنے کے مترادف نہیں ہے۔ اسلام پسندوں کی ایک بڑی اکثریت جو ایک اعتدال پسندانہ اپروچ کی حامل ہے' "اداروں کے ذریعے لانگ مارچ" کے توسط سے مقصد کا حصول چاہتی ہے۔ صرف ایک چھوٹی ریڈیکل انقلابی اقلیت مسلح جدوجہد اور تشدد کے ذریعے انقلاب لانے کے لائحہ عمل پر عمل پیرا ہے۔ تاہم دونوں گروپوں کے پیش نظر مقصد ایک ہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اسلامی ریاستوں اور غیر مسلم دنیا اور یورپ کے درمیان تعلق میں اسلام پسندی کا خطرہ کتنا حقیقی ہے' سوویت سلطنت کے انہدام کے بعد سوائے ایران کی مذہبی حکومت کے جمہوریت کا کوئی دیکھا بھالا متبادل نہیں ہے' اسلامی جمہوریہ ایران ایک ماڈل کیس ہے' جو دیگر تمام اسلامی اپوزیشن گروپوں کے لیے ویسے ہی مہمیز کا کام دیتا ہے جیسے اکتوبر انقلاب کے بعد

ماسکو بہت سے دانشور گروپوں کے لیے مکہ بن گیا تھا۔ پہلی دفعہ اسلام پسندوں کے نظریے نے "اپنے ہی ملک میں" اسلام کی فتح کے ذریعے اپنے آپ کو منوایا۔ شیعہ عقیدے کا فریم ورک' ملاں اور ریاستی قیادت کے درمیان ناکافی مضبوط تعلق اور "گرین انٹرنیشنل" اور اس سے متعلق عملی دائرہ کار کا فقدان اسلامی دنیا میں قیادت کے ایرانی دعوے کو کمزور کرتا ہے۔ تاہم لبنان میں (حزب اللہ کے) ایرانی سرگرم کار' فلسطینی علاقوں میں (حمص) اور سوڈان' جہاں حسن ترابی کی زیر نگرانی شریعہ کا نفاذ کیا گیا' متعدد خلیجی ریاستوں اور بوسنیا (جہاں اسلامی ایرانی لائن موجود ہے) توجہ کے قابل ہیں۔ ایران کا اب وسطی ایشیا کی نئی ریاستوں میں کردار بھی بڑھ رہا ہے۔ ان ریاستوں میں تاہم اسے ترکی اور عرب ملکوں کے ساتھ مسابقت کا سامنا ہے۔

اس وقت سب سے طاقتور اسلامی تحریک اسلامک سالویشن فرنٹ ہے' جس پر پابندی لگائی گئی ہے۔ اگرچہ ملک کی اہم سیاسی قوتوں کے درمیان اتفاق رائے کی کوششیں جاری ہیں' لیکن ملک کی مسلح افواج اور اسلامی مسلح گروہ جی آئی اے کے درمیان جاری کشمکش پر ہی اس وقت ملک کا امیج استوار ہے ۱۹۹۶ء میں اوران کے فرانسیسی بشپ اور فرانسیسی ننوں سمیت اب تک ۵۰ ہزار سے زائد افراد قتل ہو چکے ہیں۔ اسلام پسندوں کے درمیان ناکافی اتفاق کے باعث خانہ جنگی کا خاتمہ نظروں کے سامنے نہیں ہے۔

مشرق قریب کے دو اہم ملکوں مصر اور ترکی میں داخلی تبدیلی علاقے کی قسمت کے لیے فیصلہ کن ہوگی۔ مصر تو اپنی حربی پوزیشن اور آبادی کی بنا پر سیاسی لحاظ سے اتنا ہی اہم ہے' جتنا کہ سعودی عرب' اقتصادی حوالے سے اپنے آپ کو اسلامی تحریک کا اصل ہدف سمجھتا ہے۔ قاہرہ میں جہاں الازہر یونیورسٹی ہے اور سنی اسلام کا بھاری مرکز ہے' اسلام پسندوں کی کامیابی پورے خطے میں ردعمل کے تسلسل کی صورت اختیار کرے گی' جس کے نتیجے میں اسرائیلی عرب امن کا عمل' جو اسلام پسندوں کی شدید نفرت کا مرکز ہے' ناکارہ ہو کر رہ جائے گا۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی کے پہلے نصف میں "الجماعۃ الاسلامیہ" اور "جہاد" نامی جنگجو گروپوں کی طرف سے بڑھتے خطرے کو سیکورٹی فورسز نے روک لیا جس کا نتیجہ غیر ممالک میں مصری شخصیات پر حملوں کا سلسلہ ہے۔ جیسے ۱۹۹۵ء میں ادیس ابابا میں صدر حسنی مبارک اور ۱۹۹۵ء میں اسلام آباد کے مصری سفارت خانے پر حملہ کیا گیا' پھر نیم قانونی جماعت اخوان المسلمون' جس نے پیشہ ورانہ تنظیموں میں رسائی حاصل کرلی ہے اور جو عدلیہ سمیت "اداروں کے ذریعے پیش رفت" میں مصروف ہے' کم خطرناک نہیں ہے۔ صدر مبارک نے بار بار کہا ہے کہ وہ جنگجو اسلام پسندوں اور اعتدال پسند

اخوان المسلمون کے درمیان کوئی فرق نہیں پاتے۔ مشرق قریب میں دہشت گردی ان کے دعوے کے مطابق اخوان المسلمون کی پیداوار ہے۔

رواں کشمکش کے حوالے سے ابھی تک یہ غیر واضح ہے کہ افغانستان کا رخ کس جانب ہے۔ پاکستان کی پشت پناہی میں اسلامی طالبان کی فتح ماورانہر اور ہندوکش کے درمیان خطے کے لیے دور رس مضمرات کی حامل ہوسکتی تھی۔ کابل فتح کرنے کے بعد انہوں نے انقلابی جوش و خروش کے ساتھ سخت اسلامی مذہبی حکومت قائم کی۔ جس میں شریعہ کے نفاذ کے ساتھ ہی پہلا اقدام یہ کیا گیا کہ خواتین کو باہر آنے سے منع کردیا گیا اور نماز پڑھنے کا حکم لاگو کردیا گیا۔

سعودی عرب میں اسلامی قانون کے ساتھ روایتی بادشاہت کا راج بھی ہے' جس سے یہ اسلامی ریاست نہیں ہے۔ یہ امر قریبی مشاہدے کا متقاضی ہے کہ آیا ۱۹۹۵/۹۶ء میں امریکی تنصیبات پر حملوں کے بعد بھی ملک میں استحکام کا تاثر بجاہے؟ سعودی عرب کی ہمسایہ ریاست کویت میں اکتوبر ۱۹۹۶ء کے اوائل میں جو پارلیمانی انتخابات ہوئے' ان میں اسلام پسندوں کی نصف نشستوں پر کامیابی یہ ظاہر کرتی ہے کہ اسلام پسندی خلیج کے خطے میں بھی پیش رفت کررہی ہے۔

مسلمانوں کی تعداد میں اضافے کے باعث غیر مسلم دنیا میں بھی اسلام پسندی کا مسئلہ پیدا ہو رہا ہے اس وقت بحیثیت مجموعی ۲ کروڑ مسلمان یورپ میں مقیم ہیں۔ صرف جرمنی میں ان کی تعداد ۲.۵ ملین کے لگ بھگ ہے۔ یہ مسلمان بالخصوص برطانیہ اور فرانس میں "امہ" کی چھت تلے اقلیتی باڑے کی صورت میں اپنا ایک سیاسی نظام قائم کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ اگرچہ جرمنی میں بھی اسلامی مراکز ہیں آئینی تحفظ کی ایجنسی ان میں سے صرف ایک مقصد کو انتہا پسند قرار دیتی ہے جو مجموعی تعداد کے اعتبار سے نہایت ہی معمولی تعداد ہے۔ تاہم تازہ ترین جائزوں سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں اور ان میں سرفہرست ترکوں کی دوسری اور تیسری نسل اپنے اصل (یعنی قومی کی بجائے اسلامی) کلچر کی طرف رجوع کررہی ہے چنانچہ اربکان کا تنازعہ صرف ترکی تک ہی محدود نہیں ہے' اس عرصے میں یہ جرمنی کی مساجد تک بھی پہنچ چکا ہے۔ اس تمام صورت حال کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ فوری خطرے کی کوئی بات نہیں' تاہم بحیثیت مجموعی تبدیلی کے عمل کے بارے میں تشویش کی بات ضرور ہے۔

نتیجہ

جرمنی میں زیر نظر جائزہ کے بارے میں بحث مبالغہ آمیزی کے عنصر کے ساتھ مناظرہ بازی پر

مشتمل ہے۔ عدم رواداری اور بعض اوقات الارم بجاتی جنونیت' جس کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے نظر بیان کئے جاتے ہیں' سچ تلاش کرنے کا راستہ نہیں ہے۔ ایک طرف روحانوی اسلام کا تصور ہے جس میں وہ پہلو جو اس تصویر میں فٹ نہیں بیٹھتے' حذف کردیئے جاتے ہیں' جبکہ دوسری طرف اسلام اور اسلام پسندی کی غیر منقسم مساوات پیش کی جاتی ہے۔ دونوں ہی درست نہیں ہیں۔ ایک ایسا اسلام ویسے ہی وجود نہیں رکھتا جیسا کہ ایک ایسی ہی عیسائیت وجود نہیں رکھتی اور یہ کہ اسلام اور اسلام پسندی ایک ہی چیز کا نام نہیں ہے۔ چنانچہ مسلمانوں پر بحیثیت مجموعی دوست یا دشمن کا لیبل چسپاں نہیں کیا جاسکتا۔ مسلم دنیا کا فیصلہ کن طاقتوں کے ساتھ قابل قبول تعلق یورپ بلکہ پورے مغرب کے لیے ضروری ہے۔ یہ حقیقت کہ مسلمان ریاستیں جنوب میں یورپ کی ہمسایہ ہیں اور یورپی عوام کو مسلم اقلیتوں سے ہر وقت واسطہ رہتا ہے' یہ واضح کرتا ہے کہ پرانا براعظم اپنے روایتی دشمن کے ناقابل قبول سادہ امیج کو افورڈ نہیں کرسکتا۔ جس بات کی ضرورت ہے وہ قریبی روابط اور زیادہ معلومات کی فراہمی ہے تاکہ ان میں بہتر تفہیم ہوسکے۔

روایتی دشمن کے امیج سے بچنے کی دونوں فریقوں کو ضرورت ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسلام پسندوں کو بھی جنہوں نے "مغرب" کو اپنا دشمن قرار دے رکھا ہے۔ مزید برآں مسئلے کو معمولی اور ناکارہ قرار دینا بھی بجا نہیں ہے۔ جیسے یہ دعویٰ کہ الجزائر میں قتل پر برہمی خود قتل کے مقابلے میں زیادہ خطرناک ہے' ناقابل قبول ہے اور جیسے یہ بات کہ کچھ لوگ کمیونزم کی مخالفت کو خود کمیونزم سے زیادہ خطرہ سمجھتے تھے' بے وقار بات ہے۔

اس منطق کی پیروی کرنے کا مطلب غیرروادارانہ "سیاسی وفاداری" کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے مترادف ہے' جو آزاد شہریوں کی ان تمام اقدار کے منافی ہے جنہیں انہوں نے روشن خیالی کے ذریعے حاصل کیا تھا۔

تجربے سے واضح ہوتا ہے کہ مذہبی یا نظریاتی بنیادوں پر مبنی مطلقیت کی بنیاد پر دعوؤں سے تنازعے کی صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ اسلام پسندی جو اپنے آپ کو انقلاب خیال کرتی ہے' ایک ایسی حقیقت ہے' جسے مخاطب کرنے کی ضرورت ہے۔ دشمن کے روایتی امیج کو آگے بڑھانا نہیں' بلکہ چیلنج کا سامنا کرنا ہے۔ اسلام خود چیلنج نہیں بلکہ اس کے اسلام پسندانہ انتہا پسندی کے مختلف پہلو چیلنج ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام پسندوں نے اپنے پیش نظر جو نصب العین طے کر رکھا ہے اس میں وہ موجود سیکولر لوازمات جو باہمی رواداری پر مبنی ہیں' کو ختم کرکے بین الاقوامی نظام کو ناکارہ بنانا چاہتے ہیں اور اس کی جگہ اسلامی عالمی برادری کا متبادل مقدس ماڈل لانا

چاہتے ہیں۔

اس پس منظر میں کمیونزم کے خاتمے کا مطلب فرانسس فوکویاما' کے دعوے کے مطابق "تاریخ کا خاتمہ" اور یوٹوپیائی خوابوں کا خاتمہ نہیں ہے۔ ہنٹنگٹن کی پیشن گوئی "تہذیبوں کا تصادم" بھی ناگزیر نہیں ہے۔ اگر اسلام اور یورپی سیکولر جدیدیت کے درمیان مفاہمت ہوجاتی ہے' تو حالیہ چیلنج سے پر امن طور پر نبرد آزما ہوا جاسکتا ہے۔ وہ سمت' جس کی جانب اسلام پسند پیش رفت کررہے ہیں اور اس راستے پر انہوں نے جو کامیابیاں حاصل کی ہیں مذکورہ مفاہمت کے لیے کافی حد تک رکاوٹ ہیں۔ اسلام میں اصلاحات کے موئد جن میں ۲۰ ویں صدی کے علی عبدالرزاق اور آج کے سعید الاسماوی شامل ہیں اور جو مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کی حمایت کرتے ہیں' عوام کی حمایت حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

چاہے "امہ" کی ناقابل مفاہمت بنیادی سوچ مسلمانوں میں قائم بھی رہے ان کے پیش نظر مقصد امن کے حامل باہمی تعلقات کے اصول کی تلاش ہو۔ تصادم نہیں بلکہ تعاون کے اصول کی تلاش رہنا چاہئے۔ جس بات کی فوری ضرورت ہے' وہ مختلف ثقافتوں کے درمیان جامع اور تعمیری مکالمہ ہے جو محض سیاسی مکالے سے ماورا ہونا چاہیے۔

۱۹۸۰ء کی دہائی میں یورپ عرب مکالے سے واضح ہوتا ہے کہ محض زبانی نقطۂ ہائے نظر کے تبادلے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ باہمی تفہیم ہی سے تنازعات کے حل پر آمادگی ہوتی ہے اور یہی چیز ٹھوس تعاون کی بنیاد ہے۔

مکالمہ چاہے کسی قسم کا ہو' اسے ایک فریق کی بالا دستی کے لیے ایک خاص قسم کے سیاسی مذہبی ماڈل کے عالمگیرانہ دعوے کے لیے استعمال نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ اسے اصول اجتماعیت کی عالمگیریت کو تسلیم کرنے کا نقطہ آغاز بننا چاہیے۔ اسے ان اقدار اور روایات کے مجموعے کو پورے عزم کے ساتھ لے کر چلنا چاہیے جو عالمگیر سطح پر صدیوں سے پروان چڑھتی رہی ہیں۔ عدم رواداری کے خلاف ردعمل رواداری نہیں ہوسکتا اور نہ ہونا چاہیے ورنہ اسے اسلام پسندوں کی طرف سے مغرب کی کمزوری خیال کیا جائے گا۔

اپنی نفی کے بغیر مکالمہ مطالبات کو غلط طور پر تسلیم کئے بغیر عمل اور علاقے میں عمومی اقتصادی اور سماجی مسائل کی شدت کم کرنے کے لیے اعتدال پسند قوتوں کے ساتھ تعاون اسلام پسندی کی فضا کے خاتمے کے لیے بہترین طریقہ کار لگتا ہے' اسلام ازم' ہماری صدی کا آخری نظریہ ہے۔ اگر یورپ نہیں چاہتا کہ اسلام ازم اپنے راستے خود تجویز کرے اور نتیجتاً" یہ

اتنا بڑا ہوجائے کہ اس سے بنٹنا مسئلہ بن جائے تو یورپ کو اس چیلنج کا سامنا کرنا چاہیے۔

یورپ میں مسلم امیگریشن کا مسئلہ تمام تر مثالی نظریات سے ماورا ہوکر حل کرنا ہوگا۔ اس کا ایک حل تو وہ اقلیتی باڑے اپنے تمام تر خدشاتی نتائج کے ساتھ ہیں یا انفرادی امیگریشن کا حل ہے جو آزاد جمہوریت کو قبول کرنے کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ اگر یورپ میں مقیم مسلمان خود ساختہ تنہائی سے اجتناب کریں' تو وہ مختلف ثقافتوں کے درمیان مصالحت کنندہ بن سکتے ہیں۔ مغرب اور اسلام کے درمیان مکالمے کا مسئلہ تب تک رہے گا' جب تک اسلام کو سمجھنے کی جدوجہد جاری رہے گی۔ یہ یقینی بنانے کے لیے کہ مشرق و مغرب کے تنازعے کی جگہ کوئی نیا شمال جنوب تنازعہ نہیں لے گا اور یہ کہ یورپی ممالک دوسرے خطوں کی کشمکش کی آما جگاہ نہیں بنیں گے' اسرائیل اور اس کے عرب ہمسایوں کے درمیان امن کے عمل کو پروان چڑھانے کے ساتھ ایک انتہائی اہم بین الاقوامی ہدف اسلامی دنیا کے ساتھ تعلقات باہمی کا حصول ہے۔